اسلامی قانون بین الممالک

خطبات بہاولپور، خطبہ نمبر ۵

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

اسلامی قانون بین الممالک

خطباتِ بہاولپور۔ خطبہ نمبر:۵

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

www.facebook.com/Dr.Muhammad.Hamidullah

www.facebook.com/payamequran

زیرِ نظر مضمون "اسلامی قانون بین الممالک " دراصل اس سلسلے کا پانچواں لیکچر ہے جو ۱۹۸۰ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مرحوم) نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں مسلسل بارہ روز متعدد اسلامی موضوعات پر دیے تھے جو خطباتِ بہاولپور کے نام سے شائع ہوں چکے ہیں۔

فہرست

کچھ مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب 1908ء کو علوم اسلامیہ کے گہوارے حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے، ایل ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے یورپ پہنچے۔بون یونیورسٹی (جرمنی) سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لیٹرز کی سند پائی۔ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے۔یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ڈاکٹر صاحب السنہ شرقیہ اردو فارسی عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی فرانسیسی جرمن اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔چنانچہ مختلف اقوام و ادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی و تحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمہ قرآن مجید اور اسی زبان میں

دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کو قبول عام حاصل ہوا۔عالمی شہرت یافتہ کتاب Muhammad Rasul Allahکے مصنف ہیں۔اس کے علاوہ

The Battlefields of Prophet Muhammad

The Muslim Conduct Stare

The First Written Constitution

الوثائق السیاسیہ العھد النبوی والخلافۃ الراشدہ

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں علم حدیث کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا اہم ترین کارنامہ "صحیفہ ہمام بن منبہ" کی تحقیق و اشاعت ہے۔ یہ قدیم ترین مجموعہ احادیث ہے جو عہدِ صحابہ میں مرتب ہوا تھا۔ آپ نے اس نادر و نایاب ذخیرہ حدیث کا ایک مخطوطہ برلن میں دریافت کیا اور اسے جدید اسلوب تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کرایا۔خدمت قرآن کے سلسلے میں آپ نے پچپن برس قبل تراجم قرآن حکیم کی ببلیو گرافی "القرآن فی کل لسان" مرتب کی جس میں دنیا بھر کی ایک سو بیس زبانوں میں قرآن کے تراجم کا تذکرہ اور بطور نمونہ سورہ فاتحہ کے تراجم درج ہیں۔

تو یہ ہے اس شخص کا مختصر تعارف جس نے مغرب کی نئی نسل کو اسلام سے قریب تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔جو تقریباً نصف صدی سے زائد علم کے موتی لٹاتا رہا، جو زندگی کی آخری سانس تک فاطمہ کے بابا کے عشق میں سلگتا رہا۔۔۔جلتا رہا۔۔۔جلاتا رہا

خدا اس پر رحمتیں نچھاور کرے۔

محترم صدر! محترم وائس چانسلر اور مہمانانِ گرامی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

"انٹر نیشنل" کے لیے عام طور پر "بین الاقوامی" کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اس کے باوجود میں نے عمداً "بین الممالک" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اولاً میں اس کی توجیہ کردوں کہ قانون اصل میں سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے متعلق ہوتا ہے، حالتِ جنگ میں بھی اور حالتِ امن میں بھی سلطنت کے باشندوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی دو قوموں کے تعلقات سے اس میں بحث نہیں ہوتی بلکہ دو مملکتوں کے معاملات و مفادات سے بحث ہوتی ہے اس لیے میں اردو میں "بین الممالک" کی اصطلاح کو "بین الاقوامی" پر ترجیح دیتا ہوں۔ آج کل اس کے لیے "بین الملل" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو اسی غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ ملت کے معنی قوم کے ہیں، سلطنت کے نہیں۔ لیکن کبھی کبھی عربی میں "بین الدول" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔ یہاں "دولت" "مملکت" کے معنی میں ہیں۔ اس مختصر توجیہ کے بعد اصل موضوع پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

جس طرح کل کے موضوع کے ضمن میں، میں نے عرض کیا تھا کہ اصول فقہ ایسی چیز ہے جس پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں، اسی طرح آج کا موضوع یعنی قانون بین الممالک بھی ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کا ہی مرہونِ منت ہے اور مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے اس کو وجود بخشا۔ یہ ذرا عجیب سا دعویٰ ہے اس لیے کہ جب اس قانون کا تعلق دو خود مختار سلطنتوں کے باہمی تعلقات سے ہے اور خود مختار سلطنتیں آج سے نہیں بلکہ ہزاروں سال سے سماج میں موجود ہیں، ان میں جنگیں بھی ہوتی رہی ہیں، ان میں آپس میں پر امن تعلقات بھی رہے ہیں اس لیے یہ کہنا کہ انٹر نیشنل لاء مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے اور مسلمانوں نے ہی اسے وجود بخشا ہے، یہ بات تھوڑی سی وضاحت کی محتاج ہے۔ اصل میں اگر ہم اس علم کے آغاز پر غور کریں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا آغاز سلطنتوں سے نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے کے ایک زمانے کے افراد سے ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی جگہ خود مختار ہے، اس لیے اس قانون کی اساس ابتداً افراد کے باہمی تعلقات پر ہونی چاہیئے۔ لیکن ہم اپنی علمی ضرورتوں کی وجہ سے اس کو افراد کے تعلقات سے نہیں ملاتے بلکہ ذرا اور بعد کے زمانے سے شروع کرتے ہیں۔ افراد کے بعد کنبوں اور خاندانوں کا زمانہ آتا ہے۔ ایک کنبے یا ایک خاندان کے تعلقات دوسرے کنبے یا خاندان سے ہو، یہ بھی ایک معنی میں انٹر نیشنل چیز بن جاتی ہے۔ جب کہ ہر کنبہ اپنی جگہ خود مختار ہو اور دوسرا کنبہ بھی مساوی خود مختاری کا حامل ہو تو ان کے کچھ باہمی تعلقات ہوتے ہیں۔ جن کے لیے قاعدوں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن اسے بھی ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت اتنی اہم نہیں ہے کہ اس علم کے شایان شان ہو۔

اس کے بعد قبیلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک قبیلے میں بہت سے خاندان ہوتے ہیں اور ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ قبیلے خود مختار رہے ہیں۔ مثلاً اسلام سے پہلے عرب میں ہر قبیلہ اتنا ہی خود مختار ہوتا تھا جتنی آج کل کی بڑی سلطنتیں ہیں۔ وہ نہ صرف حالتِ امن کے تعلقات میں بلکہ حالتِ جنگ میں بھی خود مختاری رکھتا تھا۔ ہر قبیلے کا سردار دوسرے قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کر سکتا تھا، صلح کر سکتا تھا، معاہدے کر سکتا تھا۔ غرض وہ تمام کام سرانجام دے سکتا تھا جن کو اب ایک سلطنت یا ایک مملکت اپنی امتیازی شان سمجھتی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے اہل علم قبائلی دور کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کا آغاز مملکت سے کرتے ہیں، چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ مملکت سب سے پہلے ایک شہر (City state) کی صورت میں وجود میں آئی ہے۔ غالباً فرنگی مصنفین اس کو سٹی اسٹیٹ سے اس لیے شروع کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں یونان میں شہری مملکتیں پائی جاتی تھیں۔ ان میں آپس میں جنگیں بھی ہوتی تھیں، پر امن تعلقات بھی رہا کرتے تھے۔ بہر حال جو بھی ہو اگرچہ اسلام سے بہت پہلے یونان میں سٹی اسٹیٹ کا وجود تھا لیکن یہ صرف یونان سے مخصوص چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر حصے میں ہمیں نظر آتی ہے، حتیٰ کہ عرب میں بھی قبل از اسلام سٹی اسٹیٹ کا وجود نظر آتا ہے۔ عرب میں قبیلے بھی تھے اور شہر بھی تھے۔ قبیلہ اور شہر کا یہ فرق گویا اسلام کے انٹرنیشنل لاء کا ایک پیشرو تھا۔ وہاں قبیلے خانہ بدوش آبادیوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کے پاس کوئی بستی نہیں ہوتی تھی جہاں وہ سال کے بارہ مہینے رہیں۔ اس کے بر خلاف شہر تھے جہاں کے رہنے والے خانہ بدوشی کی زندگی نہیں گزارتے تھے۔

اس طرح عرب میں ہم کو بیک وقت شہری مملکتیں بھی ملتی ہیں اور قبیلے بھی ملتے ہیں۔ غالباً یونان میں ایک زمانے میں ایسا رہا ہو گا لیکن جس زمانے کے حالات سے مغربی مصنفین بحث کرتے ہیں۔ اس زمانے میں وہاں شہری مملکتیں تھیں، یعنی لوگ بستیوں میں آباد تھے۔ بہر حال زیر بحث علم کا آغاز اس دور سے ہوتا ہے جب انسان فرد سے گزر کر کنبے اور خاندان سے گزر کر قبیلے سے بھی گزر کر اس سے وسیع تر یونٹ یعنی شہری مملکتوں میں بسنے لگا تھا۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر صرف فرد کا معاملہ فرد کے ساتھ ہو تو وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ چنانچہ مرد اور عورت دو مل کر ایک کنبہ بناتے ہیں تاکہ اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کریں اور تنہا ہونے کی بجائے دو آدمی ہوں تو اپنے کسی بھی دشمن خواہ وہ فطرت کے مظاہر ہوں، یا اپنے ہم جنس انسان ہوں یا کوئی جانور، ان سب کے مقابلے کی ان میں قوت آتی ہے۔ اس کے بعد جب افراد کو بھی محسوس ہوا کہ ہم دو آدمیوں کو دوسرے دو آدمی شکست دے سکتے ہیں جو ہم سے زیادہ طاقتور ہیں، تو انہوں نے سوچا کہ بہتر ہے کہ ہم بجائے زوجین کے (یعنی مرد اور عورت) بڑے کنبے میں رہیں تاکہ دوسرے دو افراد سے آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ جس سے کنبہ وجود میں آیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ کنبے بھی بہت کمزور ہیں اور ایک کنبے کا مقابلہ دوسرے کنبے سے ہو تو بعض اوقات مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں تو کنبے سے وسیع تر دائرے یعنی قبیلے میں رہنا پسند کیا گیا۔ اجتماعیت (یا اپنی تعداد کو بڑھانے) کا یہ رجحان، انٹر نیشنل لاء اور انسانی فطرت کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ اس لیے کنبوں سے گزر کر قبیلوں سے بھی گزر کر شہری مملکتوں میں انسان بسنے لگا۔ کیونکہ ایک شہر میں کئی قبیلے رہتے تھے جس کا

نتیجہ یہ تھا کہ وہ تنہا کسی قبیلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو محفوظ بھی پاتا تھا اور شہر کے اطراف مثلاً فصیل وغیرہ بنا کر اپنی حفاظت کا انتظام کرتا اور زیادہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔

قدیم یونان کی تاریخ میں شہری مملکتوں کے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی جس کی بنا پر میں اس کو انٹر نیشنل لاء قرار دینے کے لیے آمادہ نہیں۔ یونان کے باشندے سب ایک ہی نسل کے تھے، سب ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی مذہب رکھتے تھے لیکن الگ الگ شہروں میں رہتے اور ہر شہر اپنی جگہ مطلق آزاد و خود مختار ہوتا۔ آپس میں لڑائیاں اور جنگیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن مغربی مصنفین کے بیان کے مطابق یونان کی شہری ریاستوں میں اگر کچھ معین قواعد تھے تو صرف ہم نسل یونانیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق تھے۔ ایک یونانی شہر جو خود مختار مملکت کی صورت رکھتا، دوسرے یونانی شہر کے ساتھ تعلقات میں چند معین قواعد پر عمل کرتا مگر باقی ساری دنیا کے متعلق اپنی اپنی صوابدید کے سوا کوئی معین ضابطہ یا قاعدہ نہیں تھا۔ کبھی کچھ برتاؤ ہوتا اور کبھی کچھ، کوئی اس سے باز پرس کا حق نہیں رکھتا تھا، یونانی قانون بین الممالک میں خامی یہ تھی وہ صرف ایک محدود تعداد کے انسانوں سے متعلق تھا۔ باقی ساری دنیا کو وحشی قرار دے کر یونانی اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ کسی معینہ قاعدے پر عمل کریں۔ یہ معینہ قاعدے جو ہم وطن و ہم نسل لوگوں کے متعلق تھے، وہ بھی آج ہمیں وحشت کے حامل نظر آتے ہیں کہ انٹر نیشنل لاء کے آغاز میں قدیم ترین مثالیں ہم کو یونان

میں ملتی ہیں، جہاں خود مختار شہری مملکتیں حالتِ امن و جنگ میں چند معینہ قواعد پر عمل کرتی تھیں۔ لیکن وہ صحیح معنوں میں انٹر نیشنل نہ تھا۔

اس کے بعد فرنگی مصنفین کے نزدیک انٹر نیشنل لاء کے ضمن میں رومی دور قابلِ ذکر ہے۔ اس دور میں شہری مملکتیں باقی نہیں رہی تھیں لیکن شہر روما جو ابتداً ایک خود مختار شہر تھا، ایک بڑی وسیع سلطنت کے پایہ تخت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جو یورپ کے علاوہ شمالی افریقہ اور ایشیا تک کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس دور میں جنگ بھی ہوتی رہی اور پر امن تعلقات بھی ہوتے رہے لیکن میں اس دور کو بھی قانون بین الممالک کے لیے موزوں نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرنگی مصنفوں کے بیان کے مطابق، رومی سلطنت اگر جنگ یا امن کے زمانے میں معین قواعد پر عمل کرتی تو ساری دنیا کے ساتھ نہیں بلکہ صرف ان سلطنتوں کے ساتھ جن سے اس کے معاہدے رہے ہوں۔ مثلاً ایک سلطنت سے اس کے تعلقات پیدا ہوئے، دوستانہ معاہدہ ہوا اور پھر بعد میں کسی وجہ سے جنگ چھڑی تو وہ اس قابل سمجھی جاتی تھی کہ اس کے ساتھ معینہ قواعد پر عمل کیا جائے۔ باقی دنیا کے لیے کوئی قاعدہ نہیں تھا، صرف ذاتی صوابدید پر عمل ہوتا تھا۔

ایک مثال سے شاید آپ پر واضح ہو سکے کہ حقیقت کیا تھی۔ ابتدائی زمانے میں جنگ سے پہلے اعلانِ جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور اعلانِ جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ فوج روانہ ہوتی، دشمن کی سرحد تک پہنچتی تو ایک پادری یا مذہبی رہنما، ایک نیزہ دشمن کی سرزمین میں گاڑتا اور یہی اعلانِ جنگ سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد جنگ

شروع ہو سکتی۔ بعد کے زمانے میں جب رومی سلطنت بہت وسیع ہو گئی تو دشمن کی سرحد تک پہنچنے میں ہفتوں لگ جاتے تھے۔ ایسے میں ان پادریوں کو شہر روما سے وہاں تک جانے میں دقت محسوس ہونے لگی۔ اس کا انہوں نے ایک حل سوچ لیا اور وہ یہ کہ شہر روما کے سرکاری خزانے میں مختلف ملکوں کی مٹی تھیلوں میں بھر کر رکھ لی گئی۔ جب اعلانِ جنگ کی ضرورت ہوتی تو اس خاص ملک کا تھیلہ نکالا جاتا اور پادری صاحب اس تھیلے میں نہایت متانت کے ساتھ اپنا نیزہ گاڑ دیتے، اس طرح کی عجیب و غریب باتیں انسانی تاریخ میں ملتی ہیں۔ لیکن اس موضوع کے سلسلے میں نہ صرف یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہم رومی عہد کو بھی انٹرنیشنل لاء کے لیے موزوں نہیں قرار دیتے۔ ان کا قانون اگرچہ جنگ و امن کے متعلق ہی تھا لیکن وہ اسے ساری دنیا کے لیے یکساں نہیں برتتے تھے۔ انٹرنیشنل لاء کے مشہور مورخ، اوپن ہائم نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "رومن دور میں غیر ممالک کے ذکر یا ان کے معاملات بحث کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ گنجائش ہے"۔ اس کی یہ رائے رومیوں کے اس دعویٰ پر مبنی ہے کہ دنیا رومیوں کا کرہ، اور رومیوں کی ملکیت ہے۔ کوئی اپنے گھر کے اندر قانون بین الممالک کا استعمال نہیں کرتا۔ لہذا وہ کہتے ہیں کہ رومی دور میں رومی سلطنت اور اس سے تعلقات رکھنے والے ملکوں کے باہر اجنبی ممالک سے تعلقات میں انٹرنیشنل لاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد یکا یک ایک ہزار سال کی جست لگا کر یورپی مورخ بیان کرتے ہیں کہ انٹر نیشنل لاء چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے۔ اس دوران جو اسلامی دور گزرا ہے اس کا کوئی ذکر وہاں نہیں ملتا۔ بہر حال جسے مغربی مصنفین ماڈرن انٹر نیشنل لاء کہتے ہیں، میں اس کو بھی انٹر نیشنل لاء کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء تک معینہ قاعدوں پر یورپ میں صرف عیسائی سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے ضمن میں عمل کیا جاتا رہا۔ غیر عیسائی سلطنتوں کے لیے ان معینہ قواعد پر عمل کرنے کی ضورت نہیں سمجھی جاتی۔ ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ مجبوراً یورپی عیسائی سلطنتوں نے اعتراف کیا کہ اس قاعدے کا اطلاق ایک غیر عیسائی سلطنت یعنی ترکی کے ساتھ بھی ہوگا، اس کے بعد تقریباً ساٹھ ستر سال کا وقفہ پڑا اور دوسری سلطنت جس کو یورپی حکومتوں نے انٹر نیشنل لاء کے وقاعد کا اہل سمجھا وہ جاپان تھا، جب اس نے ۱۹۰۵ کی جنگ میں روس کو شکست دی۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ اور سلطنتوں کو بھی اس کا اہل سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں کچھ شرطیں رکھی گئیں جن کو پورا کرنے کے بعد کسی سلطنت کو لیگ آف نیشنز کا رکن بنایا جاتا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز کی بجائے "مجلس اقوام متحدہ" کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں بھی ہر ملک کو اپنی ذاتی حیثیت سے رکن نہیں بنایا جاتا جب تک کہ کم سے کم دو ایسی سلطنتیں جو پہلے سے مجلس اقوامِ متحدہ کی ممبر ہوں، سفارش نہ کریں اور یہ اطمینان نہ دلائیں کہ یہ واقعی ایک متمدن ملک ہے، انٹر نیشل لاء پر عمل کرتا ہے اور اس کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ انٹر نیشنل لاء کے مطابق عمل کیا جائے۔

ان حالات میں، میں اپنے اس ابتدائی بیان کو دھراتا ہوں کہ اگر انٹرنیشنل لاء چند مخصوص قوموں کے لیے نہیں بلکہ اس کا اطلاق دنیا کے تمام ملکوں پر یکساں ہونا چاہیے تو اس قانون کا آغاز مسلمانوں سے ہوا اور شاید اب بھی مسلمانوں ہی کے ہاں وہ قانون ہے، کسی دوسرے کے پاس تاحال نہیں آیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس وقت مجلس اقوامِ متحدہ کا خود بخود یا بہ استحقاق خود ممبر بنا کسی سلطنت کے لیے ممکن نہیں ہے، جب تک دو ممبر سلطنتیں اس کی سفارش نہ کریں اور اس کی ذمہ داری نہ لیں کہ یہ واقعی ایک متمدن سلطنت ہے۔ اس کے برعکس اسلامی قانون میں اس فرق و امتیاز کی گنجائش نہیں کہ کوئی ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد پر عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ حتیٰ کے ہم دیکھیں گے کہ اگر کوئی دشمن ہمارے ساتھ غیر انسانی برتاؤ بھی کرے، تب بھی ہم اس کے ساتھ اپنے قواعد کے مطابق انسانیت کا برتاؤ کریں گے۔ ان حالات میں مجھے یہ کہنے مین کوئی تامل نہیں کہ قانون بین الممالک، جو حقیقت میں بین الممالک بھی ہو اور قانون بھی ہو مسلمانوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا آغاز کس طرح ہوا؟ اور چیزوں کی طرح یہ بھی رسول اکرم ﷺ کی سیرت پر مبنی ہے کیونکہ جب مکہ معظمہ میں اسلام شروع ہوا تو ابتداء میں بہت سی عملی دشواریاں تھیں کیونکہ مسلمانوں کے پاس کوئی علیحدہ مملکت نہیں تھی۔ وہ ایک دشمن شہر یعنی مکہ ہی میں رہتے تھے اور ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ مملکت کے اندر ایک مملکت (State within a State) کی حیثیت رکھتی تھی۔ یعنی مسلمانوں کی آبادی شہر مکہ میں تو تھی، لیکن شہر مکہ کے پرانے نظام کے تحت نہیں تھی۔ شہر مکہ کا جو پرانا حاکم تھا اس کی وہ اطاعت

نہیں کرتے تھے اور شہر مکہ کے جو قوانین تھے ان کی بھی وہ اطاعت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے سردار رسول اکرم ﷺ سے رجوع کرتے۔ ان کا اپنا علیحدہ قانون تھا، اپنی علیحدہ تنظیم تھی۔ میں یہ بھی کہتا چلوں کہ اسلام کے آغاز پر شہر مکہ واقعی ایک شہری مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔ قریش میں کچھ آزاد قبیلے تھے جو خانہ بدوش لوگوں پر مشتمل تھے اور قریش ہی میں کچھ اور قبیلے تھے جو شہر مکہ میں بس گئے تھے۔ ایسے شہروں کے حالات پر اب تک کم کام کیا گیا ہے، البتہ طائف اور مکہ کے متعلق بعض چیزیں تحریر ہوئی ہیں لیکن اور بھی شہر تھے، مثلاً شہر مدینہ کے حالات پر قانونی نقطہ نظر سے میری نظر سے آج تک کوئی چیز نہیں گزری۔ اس کے متعلق بہت کم ایسی چیزیں ملتی ہیں جن کا تعلق اسلام سے پہلے کے ادوار سے ہو۔

شہر مکہ میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کی حیثیت ایک مملکت در مملکت کی تھی لیکن جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں چند ہی ہفتوں کے اندر مسلمانوں نے ایک مملکت قائم کر دی جس کا دستور بھی ہم تک پہنچا ہے اور یہ ایک مثال ہے اس امر کی کہ مملکت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ پرانی سلطنتوں سے متعلق ہمیں بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ وہاں سلطنت کس طرح قائم ہوئی؟ شہر مدینہ کے متعلق ہمیں معینہ طور پر تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ اس شہر میں کئی قبیلے رہتے ہیں جن میں تقریباً ۱۲۰ سال سے آپس میں لڑائی بھڑائی کا سلسلہ جاری ہے۔ اور وہاں کوئی مرکزیت، تنظیم یا حکومت بالکل نہیں پائی جاتی۔ ایسے میں حضور ﷺ نے تجویز پیش کی کہ دفاعی و عدالتی اغراض کے لیے اہلِ مدینہ اپنے آپ کو

منظم کر لیں اور اپنے لیے سر دار منتخب کر لیں۔ آپ ﷺ کی اس تجویز کو مقامی باشندوں اور قبیلوں نے قبول کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ کو کیوں سر دار بنایا گیا؟ جبکہ مسلمان وہاں اکثریت میں نہیں تھے اور وہاں مسلمان بھی دو طرح کے تھے: مدنی مسلمان یعنی انصار اور مکی مسلمان یعنی مہاجر، ساتھ ہی ساتھ مدینہ کے مشرک بھی تھے جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہودی بھی تھے اور کچھ عیسائی بھی وہاں پائے جاتے تھے۔۔ اس تنوع اور باہمی اختلاف کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو مدینہ کا سر دار منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ شہر مدینہ کے قبیلوں میں آپس میں سخت لڑائی جھگڑے تھے، اس لیے عملاً یہ ناممکن تھا کہ ان قبیلوں میں آپس میں سے کسی ایک قبیلے کے کسی شخص کو سر دار منتخب کیا جائے تو دوسرے اسے قبول کر لیں۔ ب کو کیا جائے تو الف قبول نہیں کرتا، الف کو کیا جائے تو ج قبول نہیں کرتا۔ ان حالات میں انہیں یہ مناسب معلوم ہوا کہ کسی اجنبی کو سر دار بنالیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو سر دار منتخب کر لیا گیااور سر دار اور رعیت کے حقوق و فرائض دونوں تفصیل کے ساتھ ایک دستاویز میں لکھے گئے۔ یہی دستاویز ہے جسے ہم شہری مملکتِ مدینہ کا دستور کہہ سکتے ہیں۔ وہ دستور جو ہم تک پہنچا ہے اس میں اندرونی انتظامات کے متعلق کافی تفصیل سے احکامات دیے گئے ہیں اور مذہبی آزادی کا بھی اس میں صراحت سے ذکر ہے۔ دفاع کے انتظامات اور جنگ و صلح کے قواعد بھی اس میں درج ہیں۔ بہر حال جب یہ مملکت قائم ہو گئی تو بہت جلد مسلمانوں کو جنگوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ ۲ ہجری میں میدانِ بدر میں مکہ

والوں کا، یعنی شہری مملکت کا، اس شہری مملکت مدینہ کے مسلمانوں سے مقابلہ ہوا۔ انٹر نیشنل لاء میں چونکہ عموماً دو ہی چیزوں سے بحث ہوتی ہے: حالتِ جنگ اور حالتِ امن میں غیروں کے ساتھ ہمارے تعلقات۔ رسول اکرم ﷺ کو حالتِ امن کے صرف چند مہینے ملے اور اس کے بعد یہ جنگ پیش آئی۔ انٹر نیشنل لاء کا دوسرا جزیعنی حالتِ جنگ کے قوانین کیاہیں؟ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے ہمیں اس کی نظیریں ملنے لگتی ہیں۔ یعنی اعلانِ جنگ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ جنگ میں صرف بالغ مردوں کو قتل کیا جائے جو ہتھیار اٹھا کر حملہ کرسکتے ہیں یا دشمن کے ہر فرد کو، بچے کو بھی، بیمار کو بھی، عورت کو بھی، غلام کو بھی قتل کرسکتے ہیں؟ صرف میدانِ جنگ میں قتل کیا جائے یا میدانِ جنگ کے باہر بھی اسے قتل کیا جاسکتا ہے؟ اسی طرح اگر مثلاً دشمن کے آدمیوں کو ہم جنگ میں گرفتار کرلیں تو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ کیا انہیں قتل کر دیا جائے؟ یا انہیں مفت رہا کر دیا جائے، یا انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے یا انہیں تبادلہ اسیر ان کے طور پر یعنی ہمارا جو قیدی ان کے پاس ہے اس کے معاوضے میں دشمن کا قیدی جو ہمارے پاس ہے رہا کریں وغیرہ۔ اس طرح کی بیسیوں تفصیلیں جو قانونِ جنگ سے متعلق ہیں۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل مسلمانوں کے لیے نظیر بنتا گیا، کبھی تو قولی حدیث کے ذریعے سے اور کبھی فعلی حدیث کے ذریعے سے۔ بہر حال دونوں طریقوں سے اسلامی قانون اسلامی قانون بنتا گیا۔ اور انٹر نیشنل لاء کا اسلامی تصور وجود میں آیا۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا کہ غیر مسلم اجنبی کس مذہب کا ہے، یہودی ہے، بت پرست ہے، لا

مذہب ہے، اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ سب کے ساتھ معینہ قواعد برتے جاتے تھے۔ مثلاً اعلانِ جنگ کی ضرورت ہے تو یہ اعلانِ جنگ اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا جس کا کوئی مذہب ہے، اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو بت پرست ہے، اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو کسی چیز کی قائل نہیں ہے وغیرہ۔

غرض اس طرح رسول اللہ ﷺ کی دس سالہ مدنی زندگی اسلامی انٹر نیشنل لاء کے اکثر قواعد کو معین و مدون کرنے کا باعث بنی۔ چنانچہ جب اس موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو مسلمان مصنف حسبِ معمول پہلے قرآن کی طرف دیکھتے، اور قرآنی آیات کا ذکر کرتے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کے عمل کو زیرِ بحث لاتے کہ فلاں موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یوں کہایا کیا تھا، لہذا وہ اسلامی قانون ہے۔ یہ اسلامی انٹر نیشنل لاء حضور اکرم ﷺ کی مدنی زندگی کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ مکی زندگی طرف ہم کم ہی رجوع کرسکتے ہیں کیونکہ وہ مملکت در مملکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں جنگ بھی نہیں ہوئی۔ چاہے مسلمانوں کو اذیت دہی کے سلسلے میں قتل کیا جاتا رہا ہو، لیکن جنگ نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں فقہ کی ترقی ہوئی جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ جب مسلمان علماء فقہ پر کتابیں لکھنے لگے تو ان کا تصور مغربی تصور کے مقابلے میں بہت وسیع رہا۔ کسی بھی مغربی قانون کو زیادہ جامع بنانے کے لیے پہلے ہی دن سے اس کو دین و دنیا دونوں کا حامل بنایا اور اس میں صلوٰۃ، زکوۃ، روزہ، حج جیسی عبادتوں کا بھی ذکر کیا، تجارتی معاملات اور وراثت کا ذکر بھی کیا اور اس میں انٹر نیشنل لاء کا بھی ذکر کیا، ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان فقہاء کا تصور یہ رہا کہ انٹر نیشنل لاء کوئی

انٹر نیشنل چیز نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی چیز ہے۔ ہماری چیز اس معنی میں کہ اجنبی ممالک سے، حالتِ امن یا حالتِ جنگ میں جس قاعدے پر ہم عمل کریں، وہی ہمارا انٹر نیشنل لاء ہے۔ یہ نہیں کہ اس کو اوروں کے مشورے اور رضامندی سے مدون کیا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے بلکہ ان کے نزدیک اسلامی انٹر نیشنل لاء اسلامی انٹرنل لاء کا ایک جزو تھا۔ اسی لیے جب مسلمان فقہاء مجموعہ قوانین مدون کرنے لگے تو انہوں نے عبادات، معاملات، رواج اور وراثت وغیرہ کے ساتھ انٹر نیشنل لاء کا بھی ذکر ضروری سمجھا۔ اس کو بظاہر انہوں نے "سیر" کا نام دیا۔ میں بظاہر کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس وقت ہمارے پاس جو قدیم ترین فقہ کی کتاب ہے، وہ امام زید بن علی رحتہ اللہ علیہ کی کتاب "المجموع فی الفقہ" ہے۔ امام زید رضی اللہ عنہ زیدیہ فرقہ کے بانی اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے، اور امام زین العابدین کے بیٹے تھے، زید بن علی زین العابدین بہت بڑے عالم تھے۔ انہون نے "المجموع فی الفقہ" کے نام سے کو کتاب لکھی ہے، اس میں ایک باب انٹر نیشنل لاء سے متعلق ہے، جس کو "کتاب السیر" کا نام دیا گیا ہے۔ "سیر" جمع ہے لفظ "سیرت" کی۔ مشہور حنفی امام سرخسی نے اپنی "کتاب المبسوط" میں لکھا ہے کہ سیرت سے مراد حکمران کا وہ طرز عمل ہوتا ہے جو اجنبیوں سے حالت جنگ اور حالت امن میں ملحوظ رکھا جائے اور اس میں وہ اضافہ کرتے ہیں کہ غیر مملکت کے لوگ ہی نہیں ہمارے مملکت کے اندر کے باشندوں میں بھی کم از کم دو کے متعلق اس کا اطلاق ہو گا۔ ایک تو مرتدوں کے متعلق اور دوسرے باغیوں کے متعلق۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انٹر نیشنل لاء کا

اسلامی تصور، اس تصور کے مقابلے میں جو آج کل مغرب میں پایا جاتا ہے زیادہ وسیع ہے۔ بہر حال امام زید بن علی نے پہلی مرتبہ "سیر" کی اصطلاح انٹر نیشنل لاء کے معنی میں استعمال کی اور اس وقت سے لے کر آج تک اس سے اختلاف نہیں کیا گیا۔ ہر مولف حنفی، شافع، مالکی، حنبلی، شیعی وغیرہ سبھی یہی الفاظ استعامل کرتے ہیں۔ ایک واحد استثناء اور وہ بھی نکمل استثناء اس فرقے سے متعلق ہے جسے ہم خوارج کا نام دیتے ہیں۔ اس مذہب کی فقہ کی کتاب میں، جو بڑی مشکل سے میں نے حاصل کی، اس میں اس بات کا عنوان بجائے "کتاب السیر" کے "کتاب الدماء" یعنی خونوں کا قانون رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں جنگ اور خون ریزی سے بحث ہوتی ہے۔ میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو تاریخ سے معلوم ہوا کہ جو کتاب میرے پاس ہے وہ ایک ہم عصر مؤلف کی کتاب سے اخذ کی گئی ہیں اور وہ پرانا مؤلف اس کو "سیر الدماء" کا نام دیتا ہے۔ وہی "سیر" کا لفظ جو ہم استعمال کرتے ہیں وہ اس کو "دماء" یعنی خون کے ساتھ ملاتا ہے۔ "سیر الدماء" یعنی خونوں کے متعلق طرز عمل۔ لیکن حالیہ مؤلفوں نے "سیر" کے لفظ کو بوجھل پایا اور اسے حذف کر کے "کتاب الدماء" نام رکھا۔ الغرض، انٹر نیشنل لا کے متعلق قدیم ترین کتاب جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے، وہ امام زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔ جن کی وفات ۱۲۰ ہجری میں ہوئی۔ ایک معنی میں وہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد سمجھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے اموی سلطنت کے خلاف بغاوت کی لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخرکار وہ گرفتار ہوئے اور انہیں ۱۲۰ ہجری میں قتل کر دیا گیا۔ امام ابو حنیفہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی، ۱۲۰ھ اور

۱۵۰ھ کے مابین انہوں نے ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام "کتاب السیر" تھا۔ اس کی تاریخ دلچسپ ہے۔ امام ابو حنیفہ وہ فقیہ ہیں جنہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر ساری تدبیریں اور کوششیں ناکام ہو جائیں تو اسلامی سلطنت کے مسلمان حکمران کے خلاف بھی تلوار لے کر بغاوت کی جاسکتی ہے۔ دوسرے فقہاء اس طرح فتوی دینے سے جھجکتے تھے بلکہ امام ابو حنیفہ نے یہ فتوی دیا تو انہوں نے اس کی تردید کے لیے کتابیں لکھیں۔ بہر حال امام ابو حنیفہ کا فتویٰ اس حدیث پر مبنی ہے: من رایٰ منکم منکراً فلیغرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان یعنی اگر کوئی کسی برائی کو دیکھے تو چاہئیے کہ اسے بزور بدل دے اور اس کی اصلاح کرے۔ اگر بزور بدلنے کا اس کے لیے امکان نہ ہو تو کم از کم زبان سے، یعنی سمجھا بجھا کر، اسے بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کا بھی امکان نہیں ہے تو کم از کم دل ہی میں اس کو برا سمجھے۔ اگر کوئی شخص برائی کو دیکھ کر دل میں بھی اس کو برا نہیں سمجھتا تو وہ اچھا مسلمان نہیں۔ کم از کم دل میں برا سمجھنا یہ اضعف الایمان یا ضعیف ترین ایمان ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا استدلال تھا۔ دوسرے امام جو اس کے خلاف رائے رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ بغاوت نہیں کرنی چاہئیے، ان کا استدلال ایک دوسری حدیث تھی۔ وہ حدیث تھی کہ اگر حکمران تمہارے ساتھ عدل کرتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو اور اگر تم پر ظلم کرتا ہے تو صبر کرو۔ تو ایک ہی معنی میں دو حدیثیں ملتی ہیں جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ سیاق و سباق جدا جدا ہے۔ امام ابو حنیفہ یہ بھی نہیں کہتے کہ ہر وقت، ہر چھوٹی بات پر، حکومت سے بغاوت کرو بلکہ وہ شرط لگاتے ہیں کہ پر امن وسائل

کی ساری کوششیں رائگاں ہو جائیں تو اس وقت جائز ہے کہ حکمران کے خلاف ہتھیار اٹھائیں جائیں۔ بہر حال جس موضوع سے میں بحث کر رہا ہوں اس میں یعنی انٹرنیشنل لاء کی تاریخ میں اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ جب امام امام ابو حنیفہ نے وہ کتاب لکھی تو فوراً ایک معاصر فقیہ امام اوزاعی نے اس کی تردید میں ایک رسالہ لکھا۔ بد قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس نہ امام ابو حنیفہ کی کتاب موجود ہے اور نہ امام اوزاعی کا رسالہ، بجز ان اقتباسات کے جو امام شافعی نے اپنی "کتاب الام" میں جمع کیے ہیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ کن چیزوں کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے سے امام اوزاعی نے اختلاف کیا تھا۔ جب امام اوزاعی نے، جو دمشق کے فقیہ تھے، امام ابو حنیفہ جو کوفہ یعنی عراق کے فقیہ تھے، کی کتاب پر ایک رسالہ لکھا تو امام ابو حنیفہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ خود اس کا جواب دیں۔ ان کے ایک شاگرد امام ابو یوسف نے اس کا جواب لکھا۔ یہ کتاب بھی ہمارے پاس محفوظ نہیں، لیکن امام شافعی کی "کتاب الام" میں جو اقتباسات ہیں، ان میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ان اقتباسات کی مدد سے ایک کتاب مرتب کی گئی جو حیدرآباد دکن میں " مجلس دائرۃ المعارف" کے اہتمام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کتاب سے امام ابو حنیفہ، امام اوزاعی، امام ابو یوسف اور آخر میں خود امام شافعی کے نقطہ نظر اور ان کے اعتراضات وجوابات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح امام شافعی کی مذکورہ تصنیف کی بدولت ان نایاب کتابوں کا ایک بڑا نادر ذخیرہ ہمارے پاس محفوظ ہو گیا ہے اگرچہ وہ کتابیں کامل طور پر ہم تک نہیں پہنچیں۔ اس سلسلے میں ابن حجر نے اپنی کتاب "توالی التاسیس" میں جو امام شافعی کی سوانح عمری ہے، ایک جگہ لکھا ہے کہ

"سیر" پر سب سے پہلے امام ابو حنیفہ نے ایک کتاب لکھی، جس کا جواب امام اوزاعی نے دیا اور اس کا جواب الجواب امام ابو یوسف نے لکھا، پھر ان پر تبصرہ امام شافعی نے اپنی "کتاب الام" میں کیا ہے، انٹر نیشنل لاء سے متعلق تالیفوں کے آغاز کی یہ سر گزشت تھی۔

انٹر نیشنل لاء کا ذکر سب سے پہلے زید بن علی کی "کتاب المجموع" میں آیا ہے، لیکن اس کتاب کا صرف ایک باب اس موضوع سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے بیان کیا۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب سب سے پہلے امام ابو حنیفہ نے تصنیف کی اور وہ یقیناً اپنے معمول کے مطابق اپنے شاگردوں کو اس موضوع پر درس بھی دیتے رہے ہوں گے۔ امام ابو حنیف کے درس کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے خیالات بیان کرتے، پھر اپنے شاگردوں سے بھی بحث کرتے اور پوچھتے کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اس بحث کی وجہ سے مختلف پہلو واضح تر ہو جاتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کے لیکچروں کے اقتباسات کی مدد سے ایک وسیع اور جامع کتاب لکھی جا سکتی تھی اور غالباً ایسا ہی ہوا ہو گا۔ امام ابو حنیفہ کی کتاب ہم تک ہم تک پہنچی نہیں ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ بیس پچیس صفحوں کا رسالہ ہو گا۔ لیکن ان کے شاگردوں میں سے امام محمد شیبانی، امام زفر اور امام ابراہیم الفزاری کی کتابیں سینکڑوں صفحوں پر مشتمل ہیں۔ میرا خیال ہے، ممکن ہے کہ صحیح نہ ہو، کہ جب امام ابو حنیفہ اپنی کتاب کا درس دیتے رہے تو اس درس کی یاد داشتیں کتابی صورتوں میں مدون ہوئیں جو بعد میں شاگردوں کی طرف منسوب ہو گئیں۔ ان میں امام الفزاری کی کتاب ایک مخطوطے کی صورت میں مراکش میں موجود ہے۔

میں نے ایک مرتبہ اس کو پڑھنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ یہ کوفی خط میں ہے اس لیے بڑی مشکل سے صرف چند صفحے پڑھے اس کے بعد اسے التواء میں ڈال دیا۔ اب تک اس کے فوٹو میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔

امام محمد شیبانی نے کو امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے تھے، اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں، کتاب الصغیر اور کتاب السیر الکبیر، کہا جاتا ہے کہ پہلے انہوں نے السیر الصغیر لکھی تو امام اوزاعی نے طنزاً کہا کہ عراق والوں کو اس موضوع پر لکھنے کی جرات کیسے ہوئی جب کہ وہ علم حدیث سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اس پر امام محمد شیبانی نے کتاب السیر کے نام سے ایک جامع تر کتاب لکھی اور اس کا ایک ایڈیشن تیار کیا جو اتنا بڑا تھا کہ اسے جب خلیفہ ہارون الرشید کے پاس تحفہ دینے کے لیے لے جایا گیا تو گاڑی میں ڈال کر لے جانا پڑا۔ بہر حال کتاب السیر الکبیر ہمارے پاس پہنچی ہے، ایک شرح کی صورت میں۔ اس کو شرح سے الگ کر کے ہم دوبارہ مرتب کر سکتے ہیں لیکن شرح بھی بہت اچھی ہے۔ امام سرخسی نے جو پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ گزرے ہیں، اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔ امام سرخسی کی تالیف "شرح السیر الکبیر" کے بارے مین ایک بڑی عبرتناک بات آپ سے عرض کرتا چلوں۔ امام سرخسی ایک بہت ہی ذہین، حق گو اور بے باک فقیہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ان کو قید کر دیا گیا۔ میرے استادِ محترم، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رائے یہ تھی کہ غالباً امام سرخسی کو ایک فتویٰ کی بنا پر قید کی سزا دی گئی تھی۔ ان کے زمانے میں جو قرہ خانی حکمران تھے،

انہوں نے بہت سے ظالمانہ ٹیکس لگا دیے تھے۔ حکومت کی آمدنی حکمران کی فضول خرچی کے لیے کافی نہیں ہوتی تھی تو روز بروز نئے ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ امام سرخسی نے فتویٰ دیا کہ ظالمانہ ٹیکس ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کون سا حکمران ہے جو اس گستاخی کو معاف کر سکتا ہے؟ لیکن وہ بہت بڑے فقیہ تھے اس لیے یہ جرات نہیں ہوئی کہ انہیں سزائے موت دی جائے بلکہ ان کو ایک اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا۔ اس قید کے چودہ سال کے دوران کسی طرح انہیں حکمران یا مجلس کے مہتمم سے یہ اجازت مل گئی کہ ان کے شاگرد کنویں کی منڈیر پر آکر بیٹھیں اور استاد کے ارشادات کو نوٹ کرتے رہیں۔ مجلس کے مہتمم کی اس علم دوستی کا میں بھی ممنون ہوں، یقیناً آپ بھی ہوں گے۔ اس چودہ سال کے عرصے میں با آواز بلند املا کرانے کے ذریعے امام سرخسی نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی فہرست دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔ غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ "کتاب المبسوط" تیس جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ پوری کتاب کنویں کے اندر سے املا کرائی گئی۔ شرح السیر الکبیر چار جلدوں کی ضخیم کتاب ہے، وہ بھی اس قید خانے میں املا کرائی گئی۔ اس طرح شرح فلاں، فلاں کوئی درجن بھر کتابیں ہیں جو اس قید خانے کی تالیف ہیں۔ خدا نے ہمیں آزادی نصیب کی ہے۔ ہمیں چاہئیے کہ اس آزادی سے فائدہ اٹھائیں اور عالم سے سبق لیں جس نے قید خانے کے اندر، جہاں ایک بھی کتاب ان کے پاس نہیں تھی، اپنا علمی کام جاری رکھا اور علم کی وہ خدمت سرانجام دی کہ بڑے سے بڑے عالم بھی اس کے عشر عشیر پر فخر کریں۔

بہر حال ان تالیفوں میں سے ایک شرح السیر الکبیر ہے۔ یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دوں کہ کیا کوئی شخص کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر جیسی ضخیم کتابیں بغیر مواد سامنے موجود ہوئے املا کرا سکتا ہے؟ میری گزارش یہ ہے کہ استاد کے پاس کتابیں نہیں تھیں لیکن شاگردوں کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ کوئی کتاب لائیں اور پڑھیں، استاد اس کی شرح کرے۔ چناچہ کتاب المبسوط جو تیس جلدوں میں لکھی گئی ہے وہ اصل میں کتاب الکافی کی شرح ہے۔ سات آٹھ سو صفحوں کا اس کا مخطوطہ میں نے استنبول میں دیکھا ہے۔ اسے غالباً شاگرد پڑھتے تھے۔ شاگردوں کی آواز کو کنویں کے اندر سن سکتے تھے اور اندر سے جملہ بہ جملہ اس کی شرح کرتے جاتے اور شاگرد نوٹ کرتے جاتے تھے، غرض شرح السیر الکبیر اس طرح تالیف ہوئی اور میری دانست میں آج دنیا میں اس موضوع کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم امام ابراہیم الفزاری کے رسالہ کو کتاب قرار دیں تو وہ ابھی تک چھپی نہیں ہے۔ سرخسی کی شرح السر الکبیر سنہ ۱۳۳۵ھ میں حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی تھی، لیکن بدقسمتی سے اب تک اس کا کوئی نیا مکمل ایڈیشن نہیں آیا۔ مصر میں اس کے نئے ایڈیشن کی کوشش شروع ہوئی لیکن آدھے سے بھی کم حصہ اب تک چار جلدوں میں شائع ہوا ہے، باقی حصہ میرے ان لیکچروں کے وقت تک چھپ نہیں سکا۔ اس کتاب کی اہمیت دیکھ کر یونیسکو Unesco نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے، یہ کام میرے سپرد ہوا اور میں نے اس کا ترجمہ مکمل کر کے بھیج دیا، لیکن اب تک اس کی اشاعت کی بھی نوبت نہیں آئی۔ بہر حال اس ترجمہ کے سلسلے میں میرے سامنے حیدر آباد دکن

دائرہ المعارف کا ایڈیشن بھی رہا اور صلاح الدین منجد کا شائع کردہ نیا ایڈیشن بھی میرے سامنے رہا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ناکافی ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے استنبول جانے کا سالہا سال تک موقع ملتا رہا اور تین تین مہینے ہر بار رہ کر وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کر موقع پاتا رہا۔ چنانچہ اس کتاب کے ترجمہ میں جہاں کہیں مجھے کوئی دشواری نظر آئی میں ان مخطوطوں کی طرف رجوع کرتا جو استنبول میں ہیں۔ ایک مخطوطہ مجھے بیروت میں بھی ملا اور ایک پیرس میں بھی ملا جو سب سے قدیم نسخہ ہے اور ان مخطوطوں کی مدد سے میں ان مقامات کا جن کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا صحیح لفظ معلوم کر سکا اور اس طرح یہ ترجمہ مکمل ہوا۔

انٹر نیشنل لاء کی تاریخ میں، جیسا میں نے ابھی آپ سے عرض کیا، یہ کتاب جو امام محمد شیبانی نے لکھی ہے، بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے ہم عصر لوگوں میں ابراہیم الفزاری جو امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے، انہوں نے بھی ایک کتاب لکھی۔ یہی نہیں بعض اور ممتاز اور مشہور فقہاء نے بھی اس موضوع پر کام کیا چنانچہ امام مالک نے بھی کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بد قسمتی سے اب یہ کتاب ناپید ہے۔ ان کی کتاب المؤطا میں مشکل آدھے صفحے کا ایک باب ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہماری ضرورتوں کے لیے کافی نہیں۔ اسی طرح ان کے ایک اور معاصر، مشہور مورخ واقدی نے بھی "کتاب السیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بھی اب نایاب ہے لیکن امام شافعی کی "کتاب الدم" میں "سیر الواقدی" کے نام سے ایک بہت طویل اقتباس ہے تقریباً پچاس ساٹھ بڑی تقطیع کے صفحوں کا۔ شاید وہ واقدی کی کتاب کی نقل یا اقتباس ہو۔ اس موضوع پر

ابتدائی کتابیں تھی اور آخری کتابیں بھی یہی ہیں۔ یعنی ایک خاص زمانے میں کسی خاص ضرورت سے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ پھر اس کے بعد شاید اس کی ضرورت نہ رہی اور یکایک یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اس علم سے مسلمانوں کی دلچسپی برقرار رہی، اس معنی میں فقہ کی جتنی کتابیں ابتدا سے لیکر آج تک لکھی گئیں چاہے وہ کسی بھی مذہب اور فرقے کی ہوں، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، شیعی یا فاطمی وغیرہ، ان سارے مؤلفوں کی کتابوں میں "کتاب السیر" کا باب ضرور ملتا ہے۔ مجھے کچھ مقابلہ کرنے کا موقع ملا تاکہ یہ معلوم کروں کہ شیعہ، سنی اور فاطمی وغیرہ مؤلفوں کے خیالات میں اس موضوع سے متعلق کوئی فرق ہے یا نہیں؟ حیرت ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ ہم عقائد کی بنا پر ضرور جھگڑیں گے، سنی شیعوں سے، شیعہ سنیوں سے، لیکن ان کی فقہ میں کوئی ایسا امتیاز نظر نہیں آتا کہ یہ شیعہ قانون ہے اور یہ سنی قانون ہے۔ سبھی اپنے آپ کو اولاً قرآن اور ثانیاً سیرت پر مبنی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں کیا فرق ہو گا۔ تاریخی واقعات میں چاہے ایک کا راوی فلاں اور دوسری کا راوی فلاں دوسرا اصحابی ہو لیکن جس چیز کا ذکر ہو گا اس چیز میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ سو سال سے جو فقہ کی کتابیں چار دانگِ عالم میں لکھی جاتی رہیں اور مختلف مذہبوں کے مؤلفوں کے قلم سے نکلی ہیں، ہم ان مین ہر جگہ "کتاب السیر" کو پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو کتاب کتابوں کا اقتباس کہی جاتی ہے ،یعنی "فتاوائے عالمگیری" اس میں بھی اس پر ایک باب ہے بہت ہی دلچسپ معلومات اس سے ملتی ہیں خصوصاً اس بنا پر کہ بعض ایسی کتابیں جن سے عالم گیر بادشاہ کے زمانے میں استفادہ ممکن تھا، اب نایاب ہو گئی

ہیں اور ان کے اقتباسات اس میں ملتے ہیں۔ ان کتابوں کا جو سلسلہ شروع سے جاری رہا وہ ایک معنی میں شرح اور تمثیل ہو سکتا تھا، یعنی اصولوں اصولوں کی حد تک کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مثالیں زیادہ دی جاتی ہیں، تشریحیں اور تفصیلیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مجھے ایسا نظر آیا کہ بعض ممالک کی خصوصیات کی وجہ سے بعض چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کو بعض دیگر ممالک کے لوگ بیان نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر امام سرخسی اپنی کتاب میں جنگ کے دوران میں بیلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگ بیلوں پر بیٹھ کر دشمن سے جنگ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی ملک میں ہو گا جہاں بیل ہوتے ہیں۔ ورنہ اور ملکوں میں مثلاً عرب میں بیلوں کا ذکر نہیں آئے گا۔ اسی طرح مالکی مذہب کے مورخ اور مؤلف جن کا تعلق شمالی افریقہ سے ہے اورر ان کے تعلقات اسپین وغیرہ سے زیادہ قریبی رہے، اکثر زہریلی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی تیر میں زہر شامل کیا جاتا تھا تاکہ اگر دشمن زخمی ہو تو اس کا زخم اچھا نہ ہو پائے۔ اس کا ذکر مجھے اور مقاموں کی کتابوں میں نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا رواج دوسرے ملکوں میں نہیں تھا۔ اسی طرح امام سرخسی کی کتابوں میں سامان لانے اور لے جانے کے لیے گاڑیوں کا ذکر آتا ہے۔ دوسرے مؤلفوں کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً ان کے زمانے میں جانور پر سامان لاد دیا جاتا تھا۔ گاڑی کے اندر سامان رکھ کر اس کو جانور کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا رواج ان ملکوں میں نہیں تھا۔ غرض بہت سی مخصوص معاشرتی مثالیں ہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں۔ یہ چند تفصیلیں انٹرنیشنل لاء کی تاریخ کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیں۔

اب کچھ مختصراً اس کے مندرجات کا آپ سے ذکر کروں گا کہ انٹرنیشنل لاء میں کیا چیزیں بیان ہوتی ہیں۔ آج کل ہمارے زمانے میں "Public International Law" اور Private International Law دو مختلف فن اور مختلف علم سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے فقہاء کی کتابوں میں یہ امتیاز نہیں ملتا۔ ایک ہی کتاب میں دونوں علوم کے احکام بیان کرتے ہیں۔ کچھ مثالیں دے کر واضح کروں گا کہ ان دونوں علوم میں کیا فرق ہے۔ Private International Law میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری سلطنت کی رعیت سے ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف Public International Law میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت سے ہوتے ہیں۔ اس کی رعیت سے براہ راست تعلقات نہیں ہوتے۔ یہ بنیادی فرق ہے۔ میں آپ کو کچھ مثالیں دیتا ہوں۔ مثلاً قومیت (Nationality) کا قانون کہ ایک شخص کو کس شہریت کا حامل سمجھا جائے گا یا وہ اپنی قومیت کو بدل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر بدل سکتا ہے تو ان احکام و قواعد کے ذریعے سے؟ اس کا ذکر پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں آئے گا۔ پبلک انٹرنیشنل لاء میں اس کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس اور بھی چیزیں ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان مؤلفوں کے تصور کے مطابق اس پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں مسلمانوں کے اندرونی تعقات کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ مثلاً شیعہ اور سنی فرقوں کے تعلقات پر قانونی نقطہ نظر سے بحث ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک حاکم کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ مرنے والا مذہباً شیعہ ہے اور اس کی بیوی جو وارث بنی ہے، وہ سنی ہے۔ کس قانون کے مطابق وراثت وراثت تقسیم کی جائے گی؟ اس مسئلے کا تعلق

مسلمانوں کے پرائیویٹ انٹر نیشنل لاء سے ہو گا۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک مسلمان فردِ رعیت نے کسی اجنبی ملک کے فردِ رعیت سے کاروبار اور تجارت وغیرہ کے سلسلے میں معاہدہ کیا۔ اجنبی ملک کا قانون حکم دیتا ہے کہ جو شخص سرکاری طور پر بالغ نہ ہو یعنی اس کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو تو اسے معاہدہ کرنے کا حق نہیں، اس کا کیا ہوا معاہدہ لغو سمجھا جائے گا۔ اسلامی قانون میں عمر کا تعین نہیں ہے بلکہ جسمانی بلوغ دیکھا جاتا ہے جو ممکن ہے اٹھارہ سال سے کم عمر میں ہو جائے۔ ایک مرتبہ کسی جھگڑے کی وجہ سے مقدمہ عدالت کے سامنے آتا ہے اور وکیل صاحب کہتے ہیں کہ میرے مؤکل نے جب معاہدہ کیا تھا، وہ نہ بالغ تھا، اس پر کوئی ذمہداری عائد نہیں ہوتی، لہذا معاہدہ کالعدم قرار دیا جائے۔ اس قسم کے جو مسائل ہوتے ہیں ان کا تعلق پرائیویٹ انٹر نیشنل لاء سے ہوتا ہے اور اس کے قواعد مقرر ہیں کہ مدعی علیہ کے قانون کے مطابق عمل کیا جائے گا، مدعی کے قانون کے لحاظ سے نہیں کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بر خلاف پبلک انٹر نیشنل لاء میں تین چیزوں قانونِ امن، قانونِ جنگ اور قانونِ غیر جانبداری سے بحث ہوتی ہے۔ قانونِ غیر جانبداری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں ہماری حکومت مثلاً غیر جانبدار رہے تو اس کے تعلقات دونوں فریقینِ جنگ کے ساتھ کس طرح کے ہوں گے؟ یا فریقِ جنگ کے تعلقات ان ملکوں سے جو جنگ میں شریک نہیں ہیں، کس طرح کے ہوں گے؟ اس کی کچھ تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ قانونِ امن میں زیادہ تر تین چار چیزوں سے بحث ہوتی ہے۔ Sovereignty یعنی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ سے کہ کس مملکت کو خود مختار سمجھا جائے۔ انٹر نیشنل لاء کی جدید

کتابوں میں، واقعتاً خود مختار سلطنتوں کے علاوہ باغیوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے، مگر اس وقت جب ان کی بغاوت ترقی کر کے ایک حد تک مستحکم ہو جائے اور وہ کسی علاقہ پر خود مختارانہ طور پر حکمرانی کرنے لگیں۔ اسی طرح اس میں Sovereignty کی تفصیلات ہوتی ہیں کہ کن کن چیزوں میں Sovereignty کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ برٹش انڈیا میں انگریزی دور میں ایک علاقہ تھا جس پر انگریز براہ راست حکومت کرتے تھے۔ لیکن کچھ ریاستیں بھی تھیں جیسے بہاولپور، حیدر آباد اور کشمیر وغیرہ۔ آیا ان ریاستوں کو انٹر نیشنل لاء کی اغراض کے لیے مملکت تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر کیا جائے گا تو اس کے قواعد کیا ہوں گے ؟ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ریاست سو فیصد خود مختار نہ ہو لیکن اسے ایک حد تک خود مختاری حاصل ہو مثلاً اسے اس کی اجازت ہو کہ اپنا ایک سفیر رکھے، چاہے ساری دنیا کی مملکتوں میں نہیں، صرف ایک ہی سلطنت میں تو بھی ہم اسے انٹر نیشنل لاء کا موضوع قرار دیں گے۔ غرض اسی طرح کی تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ایک دوسرا باب جائیداد(Property) کے متعلق ہے جس میں زیادہ تر فتوحات سے بحث ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسری سلطنت کا کچھ علاقہ فتح کر لیں تو کیا وہ خود بخود ہماری سلطنت کا جزو بن کاتا ہے یا اس کے لیے کوئی رسمی کاروائی درکار ہے ؟ اگر ہے تو وہ کیا ہوتی ہے ؟اسی طرح جائیداد کی فروخت کرنے کے متعلق بھی اس میں بعض دلچسپ چیزیں ملتی ہیں یعنی کبھی تو فتح کے ذریعے کسی علاقے پر قبضہ ہوتا ہے، کبھی تبادلہ علاقہ کے ذریعے سے ایک علاقہ دوسری سلطنت کو دیا جاتا ہے یا کبھی تحفہ کے طور پر۔ اس کی بہت سی مثالیں اسلامی تاریخِ ہند میں ملتی

ہیں۔ دو حکمرانوں میں ایک علاقہ کے متعلق جھگڑا ہوتا ہے، بالآخر اس بات پہ مصالحت ہو جاتی ہے کہ میری بیٹی کا نکاح تمہاری بیٹی سے ہو جائے تو میں جہیز میں وہ علاقہ تمہیں دے دوں گا، ہار مان کر نہیں دوں گا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں تاریخ میں پیش آتی رہی ہیں۔ جائیداد کے متعلق جو قواعد ہیں ان کا بھی اس میں ذکر کیا جاتا ہے۔

اس میں ایک اور چیز کا ذکر آتا ہے: Jurisdiction یعنی دائرہ اختیار سماعت کے متعلق کہ ایک ملک کے قواعد دوسرے ملک کی رعیت پر چلیں گے یا نہیں، اور چلیں گے تو کس حد تک چلیں گے اور کون سا قانون نافذ ہو گا؟ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز آپ کے سامنے عرض کروں۔ امام محمد شیبانی کی "السیر الکبیر" میں ایک باب بہت دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر غیر ملک کے لوگ ہمارے ملک میں آئیں اور ہماری عدالت سے رجوع کریں تو ہمارا قاضی ان پر انہی کا قانون نافذ کرے گا۔ فرض کیجئے کہ دو ہندو پاکستان آئے۔ ان میں آپس میں جھگڑا ہوا اور وہ ہماری عدالت سے رجوع کرتے ہیں تو ہندوؤں یا ہندوستان کا قانون ان پر نافذ ہو گا، پاکستانی قانون کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء اور ہمارے قاضیوں کو غیر ملکیوں کے قانون سے واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ غالباً عہدِ نبوی کی بعض مثالوں سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں چند یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نوجوان جوڑے کو پکڑ کر کہا کہ انہوں نے آپس میں زنا کیا، تو رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ

توریت میں زنا کا کیا حکم ہے؟ شروع میں انہوں نے کہا کہ ان کے منہ پر کالک لگائی جائے اور انہیں گدھے پر اس طرح سوار کرایا جائے کہ گدھے کے منہ کی طرف ان کی پیٹھ ہو۔ گدھے کی دم کی طرف ان کا منہ ہو اور انہیں سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے گھمایا جائے۔ رسولِ کریم ﷺ نے کہا، نہیں تم جھوٹ کہتے ہو! پھر کہا کہ توریت کا نسخہ لاؤ اور جب نسخہ لایا گیا تو فرمایا کہ ایک نو مسلم یہودی حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کی موجودگی میں پڑھو۔ یہودی نے پڑھنا شروع کیا۔ ایک مقام پر انگلی رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا "یہ انگلی اٹھا کر نیچے عبارت پڑھو۔" وہاں لکھا تھا کہ زنا کی سزا رجم ہوگی۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان کو رجم کرایا۔ یہ نظیر بتاتی ہے کہ اجنبیوں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا، بلکہ انہی کا قانون نافذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام محمد شیبانی نے کئی صفحوں کی طویل بحث میں بتایا ہے کہ اجنبیوں پر اجنبیوں کا قانون ہماری عدالت میں کس انداز سے نافذ ہوتا ہے۔ اسی طرح انٹرنیشنل لاء کے قانون میں امن (Law of Peace) کا تعلق سفارت سے ہے۔ قدیم زمانے میں مستقل سفیر نہیں ہوتے تھے بلکہ معینہ غرض کے لیے معینہ مدت کے لیے بھیجے جاتے تھے اور کام سرانجام دینے کے بعد واپس آجاتے تھے۔ اس سلسلے میں امیر علی نے History of Saracens میں لکھا ہے کہ مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے دو سو سال پہلے مسلمانوں میں ہوا۔ یہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ قانونِ جنگ میں جن مسائل پر بحث ہوتی ہے۔ وہ یہ ہیں کہ انسانوں کے متعلق قانونِ جنگ کیا ہے؟ قانون کے متعلق قانونِ جنگ کیا ہے؟ جنگ کے خاتمے پر جو معاہدہ یا صلح نامہ ہوتا ہے، اس میں کن

عناصر و شرائط کا ہونا ضروری ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مختصراً یہ کہ انٹرنیشنل برتاؤ یعنی ایک مملکت کے دوسری مملکت سے باہمی تعلق میں جن اصول وضوابط پر عمل کیا جاتا ہے اس کا مجموعہ انٹرنیشنل لاء کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

کچھ سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال۱: آپ نے فرمایا کہ بقول سید امیر علی مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے پہلے مسلمانوں نے تقریباً دو سو سال قبل کیا۔ یہ مسلمانوں کی کون سی حکومت کے زمانے میں ہوا؟

جواب: اگر آپ میرے ماخذ History of saracens کو دیکھیں تو آپ کو اس کی تفصیل مل جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بنو عباس کے آخری دور میں مسلمانوں کی آزاد سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں امیر علی نے لکھا کہ خلیفہ کا نمائندہ ان عملاً آزاد اسلامی مملکتوں میں ہوتا تھا اور ان عملاً آزاد مملکتوں کا ایک نمائندہ خلیفہ کے دربار میں مستقلاً رہتا تھا۔ یہ نہیں کہ کسی متعین کام کے لیے آیا اور چلا گیا ہو۔

سوال ۲: مکی دور میں مسلمان ریاست مکہ کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے کیا تاریخی دلیل ہے کہ مسلمان اہلِ مکہ کے اس دستور کی اطاعت نہیں کرتے تھے جو اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف نہیں تھا۔ کیا یہ اطاعت اولی الامر کے خلاف نہیں ہے؟ کیا اسے غیر مسلم بغاوت کا نام نہیں دے سکتے؟

جواب: میں نے بیان کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے اہلِ مکہ اپنے ہر مسئلے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چاہے ان کا آپس میں جھگڑا ہو یا کسی چیز پر بغیر جھگڑے کے عمل کا سوال ہو۔ شہری مملکت مکہ میں دو مستقل کے وزیرِ عدلیہ پائے جاتے تھے، ایک دیوانی مقدمات کے لیے اور ایک فوجداری مقدمات کے لیے، لیکن مسلمان ان افسروں کے پاس نہیں جاتے تھے، غرض میرا منشاء یہ ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمان اپنی ہر چیز کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس کو میں نے مملکت در مملکت کا نام دیا۔ جب مسلمان اہلِ مکہ کی مملکت کو قبول ہی نہیں کرتے تھے تو اس کے احکام کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اولی الامر اس وقت ہوں گے جب وہ ہمارے اولی الامر ہوں گے۔ اہلِ مکہ اس کو یقیناً بغاوت سمجھتے ہوں گے اسی لیے وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو اذیتیں بھی دیتے تھے۔ بعض کو انھوں نے قتل بھی کیا اور یہ داستان تاریخِ عالم کے المیوں میں سے ایک ہے کہ کس طرح اہلِ مکہ ہر اچھی چیز کو دیکھتے ہوئے بھی محض اپنی ہٹ دھرمی کے باعث اس کو قبول کرنے سے سالہا سال تک انکار کرتے رہے۔ لیکن الحمدللہ اس المیے کا اختتام اچھا ہوا۔ یعنی فتح مکہ کے دن ایک چھوٹا سا واقع پیش آیا جس کی وجہ سے سارے اہلِ مکہ اپنی دشمنی کو بھول کر خلوصِ دل سے اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ شاید رسول اللہ ﷺ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، ہر شخص آئے۔ چنانچہ کعبہ کی مسجد کے احاطے میں میں سب لوگ آئے اور سوچ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں کوئی سزا سنائیں گے۔ غرض پریشانی کے عالم میں مکہ کے مفتوح لوگ وہاں آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں۔ایک غیر مسلم نے جب کعبہ کی چھت پر سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دیتے ہوئے سنا تو اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے مشرک کے ساتھ کانا پھوسی کی کہ خدا کا شکر ہے میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ برداشت نہ کر سکتا کہ خدا کے گھر پر ایک کالا گدھا چڑھ کر رینگے (نعوذ باللہ)۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر کچھ اشارۃً انہیں بتایا کہ گزشتہ بیس سال سے تم میرے ساتھ جو سلوک کرتے رہے ہو، اب اس سلسلے میں مجھ سے کیا توقع رکھتے ہوں؟ رسول اللہ ﷺ کا جواب تاریخی نقطہ نظر سے بھی قابلِ ذکر ہے، نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی، اور اس کے نتائج بھی حیرت انگیز ہیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ چاہتے تو یہ حکم دیتے کہ ان سارے اہل مکہ کو قتل کر ڈالو۔ آپ کے پاس فوج تھی، قوت تھی اور شہر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اور شاید وہ اس کے مستحق بھی تھے کہ انہیں سزائے موت دی جائے۔ کم از کم یہ حکم دے سکتے تھے کہ اہلِ مکہ کی ساری جائیداد لوٹ لو کیونکہ وہ مسلمانوں کی جائیدادیں لوٹ چکے تھے۔ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ ان کو غلام بنالو۔ اس کے وہ مستحق بھی تھے اور اس کا امکان بھی تھا۔ مگر خدا کے آخری پیغمبر ﷺ نے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ ﷺ کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلا "آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہیں، کوئی محاسبہ نہیں، جاؤ تم سب کو رہا کیا جاتا ہے --------" لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔اس پر وہی شخص جو ابھی تھوڑی دیر پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر طعن کر رہا تھا، بے

اختیار یکایک اٹھا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے حاضر ہو کر کہا "اے محمدؐ میں عتاب بن اسید ہوں یعنی آپ ﷺ کا مشہور دشمن: اشھدلا الٰہ الااللہ و اشھدان محمداً رسول اللہ۔ اس اعلانِ معافی کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ عتاب بن اسید ہی نہیں، سارے شہر مکہ نے راتوں رات خوشدلی کے ساتھ اسلام قبول کیا اور پھر جب دو سال بعد آپ ﷺ کی وفات ہوئی، اور بہت سے قبیلے مرتد بھی ہوئے، تو جن لوگوں نے اسلام پر برقرار رہ کر، بغیر ہچکچائے، اسلام کی خدمت کے لیے خود کو پیش کیا ان میں سب سے آگے اسی شہر مکہ کے لوگ تھے، جسے مسلمانوں نے بزور، اور قوت کے ذریعے سے فتح کیا تھا۔ میں اس قصہ کی تکمیل کرتا ہوں کہ جب عتاب بن اسید نے کلمہ پڑھا تو رسول اللہ ﷺ کا جواب کیا تھا؟ جواب یہ تھا کہ میں تمہیں شہر مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔ ایک سیکنڈ پہلے کے دشمن کو اسی مفتوحہ شہر کا مطلق العنان حکمران بنا کر مدینہ واپس آجاتے ہیں اور مکہ میں اپنا ایک سپاہی بھی Garrison کے طور پر نہیں چھوڑتے اور اس پر آپ کو پچھتانا بھی نہیں پڑا۔ یہ چند باتیں ہیں جو ہمیں اس سلسلے میں پیش نظر رکھنی چاہئیے۔ اسلام دیگر قسم کی دنیاوی اور مادی تحریکوں کی طرح نہیں تھا۔ وہ ربانی عنایت تھی جو انسانوں تک پہنچائی گئی اور اس پر عمل کرنے والا وہ کردار تھا جس نے تاریخِ عالم میں اپنا لاثانی نقش چھوڑا ہے۔ آج بھی جو لوگ غیر جانبداری سے مطالعہ کرسکتے ہیں وہ اس پر سر دھننے پر مجبور ہیں۔ ان حالات میں میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانانِ مکہ کو اہلِ مکہ کی اطاعت کرنے کی ضرورت تھی،

کیونکہ وہ ایک نئی آئیڈیالوجی پیش کر رہے تھے جس میں اہلِ مکہ کے لیے بھلائی تھی، بشرطیکہ وہ اسے قبول کرتے۔

سوال ۳: انٹرنیشنل لاء کے تاریخی ارتقاء کے سلسلے میں آپ نے یونانی اور رومی سلطنتوں کے قوانین کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا قومِ سبا کے ساتھ سفارت کا ذکر قرآن پاک میں واضح طور پر ملتا ہے۔اس ضمن میں اس کا کیا مقام ہے؟

جواب: یونانیوں اور رومیوں کے علاوہ اور بھی قوموں کے ذکر کی ضرورت ہے، ہندوؤں یہودیوں بلکہ ریڈ انڈین لوگوں کا ذکر بھی آسکتا ہے۔ ہمارے پاس بہت سی معلومات ہیں لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان کا ذکر نہیں کر سکا۔ یہو سدی قانون کے سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام بھی آئیں گے۔ یہودی قانون صرف وہ نہیں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا بلکہ ان کے بعد کی صدیوں میں اس میں تبدیلیاں اور اضافے بھی ہوتے رہے۔ لیکن یہودی قانون کا کم از کم موجودہ توریت کی بنا پر تاریخِ اسلام کے درخشاں ابواب سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب تثنیہ کو آپ پڑھیں، اس میں ان کے بیان کے مطابق خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتا ہے کہ جب تم کسی شہر کے قریب پہنچو، اس پر قبضہ کرنے کے لیے، تو پہلے وہاں کے لوگوں کے سامنے امن پیش کرو، اگر وہ اس کو قبول کر کے اپنے دروازے کھول دیں تو تم شہر میں فاتحانہ داخل

ہو جاؤ اور مفتوحہ شہر کے سارے لوگ تمہارے خراج گزار بنیں گے اور تمہارے خدمت گار رہیں گے۔ اس کے بر خلاف اگر وہ مقاومت کریں اور تم بعد میں اس شہر کو تلوار کے زور پر فتح کر لو تو وہاں کے کسی متنفس کو زندہ نہ رکھو۔ مرد، عورت، بچے، بوڑھے، گدھے، اونٹ، جانور وغیرہ ان سب کو تہ تیغ کر کے ختم کر دو۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب قانون ہے۔ اس کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کی کتاب توریت ہمیں ملتی ہے، وہاں بھی اسی Genocide کے قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایسی باتیں ملتی ہیں کہ یہودی فلاں شہر میں گئے اور انہوں نے وہاں کی عورتوں، بوڑھوں، دودھ پیتے بچوں اور جانوروں وغیرہ سب کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد حضرت اشموئیل علیہ السلام کی کتاب دیکھیے۔ اس میں بھی ہمیں یہی چیزیں ملتی ہیں۔ یہ تھا وہ قانون جو یہودیوں کے دین نے سکھایا۔ شاید اسی کا اثر ہے کہ آج بھی ہم اسرائیل میں وہ بات نہیں پاتے جو ایک متمدن قوم میں ہونی چاہیئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام یقیناً پیغمبر تھے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام، یوشع علیہ السلام اور اشموئیل علیہ السلام کی طرف موجودہ توریت میں جو چیزیں منسوب ہیں وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ یقیناً یہودی تاریخ میں بھی انٹرنیشنل لاء ملتا ہے، حالتِ جنگ میں بھی اور حالتِ امن میں بھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا جو تعلق ملکہ بلقیس سے رہا وہ اس کی ایک مثال ہے۔ وہ حالت امن کے روابط کے سلسلے میں ورنہ جنگ دونوں میں نہیں ہوئی تھی۔

سوال ۴: آنجناب نے فتنہ ارتداد کے خلاف جہاد کے بارے میں پہلے اجماع ہونے کی رائے ظاہر کی تھی۔ بخاری شریف میں آنحضرت ﷺ کی وفات کے بیان میں مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جو یہ کہے گا کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہوگئے ہیں میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ نے خطبہ دیا اور کچھ قرآنی آیات تلاوت کیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے تمام صحابہ خاموش ہوگئے۔ کیا اس واقعہ کو صحابہ کا پہلا اجماع قرار نہیں دیا جاسکتا جو آنحضرت ﷺ کی وفات پر صحابہؓ کے مابین ہوا؟

جواب: میں عرض کروں گا کہ اجماع اسی وقت ہوتا ہے جب قرآن و حدیث ساکت ہوں اور جب قرآن کی آیت پیش کی جائے اور اس پر سب سر تسلیم خم کریں تو میں اسے فنی نقطہ نظر سے "اجماع" نہیں کہوں گا۔

سوال ۵: پاکستان میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی سوسائٹی کو اسلامی رنگ دینے کے لیے اسلامی قانون ضروری ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جب تک انفرادی اصلاح نہ ہو جائے، اس وقت تک اسلامی قوانین نہ پورے طور پر نافذ ہوسکتے ہیں اور نہ ہی معاشرے کو اسلامی رنگ دیا جاسکتا ہے۔ آپ کی رائے میں کون سا خیال درست ہے؟

جواب: اگرچہ یہ سوال آج کی تقریر سے متعلق نہیں، بہر حال میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ہم اسلامی معاشرے کی اصلاح کے بعد اسلامی قانون نافذ کرنا چاہیں تو اس کے انتظار میں قیامت آجائے گی۔ اس لیے بیک وقت اصلاح کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے اور اسلامی قانون بھی نافذ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اسلامی قانون بہت سے لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ سزا کے خوف سے نیک بنیں۔ مثال کے طور پر ایک چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں اور اسے وحشیانہ قرار دیتے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اگر ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ کی جائے تو مملکت کے سارے باشندے بے ہاتھ والے نہیں ہو جائیں گے۔ ایک یا دو آدمیوں کا ہاتھ کٹتا ہے پھر اس سے سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو گی اور کسی کو چوری کی جرات نہیں رہے گی۔ یہ چیز بہتر ہے کہ ایک دو آدمیوں کے ہاتھ کٹیں، پھر سارے لوگ اطمینان سے سو سکیں۔ نہ چوری کا ڈر، نہ ڈاکے کا خوف۔ یا وہ صورت جو میں نے اپنی آنکھوں سے پیرس میں دیکھی ہے کہ چور کو اپنے گھر سے بھی زیادہ آسائش سے جیل خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بعض کام چوروں کو ترغیب مقصود ہوتی ہے کہ بجائے محنت کرکے کمانے کے، جس سے ذرا تکلیف ہوتی ہے، سرکاری مہمان نوازی کا لطف اٹھائیں۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ میری رائے میں نفاذ قانونِ اسلامی اور تربیتِ اسلامی دونوں کاموں کو بیک وقت ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس کے بر خلاف عمل کیا جائے تو ہمیں قیامت تک انتظار ہی کرنا پڑے گا۔

سوال ۶: اسلام میں دوسری ریاست پر جارحیت کرنا جائز نہیں لیکن مدینہ کی ریاست جب مضبوط ہوگئی تو مکہ پر حملہ کرنے میں پہل کی گئی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: مکہ پر حملہ کرنے میں مسلمانوں نے پہل کی تھی، اس کا ثبوت آپ کو پیش کرنا چاہیئے غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ حدیبیہ مقام پر ۶ھ میں مسلمانوں اور اہلِ مکہ کے درمیان صلح ہوئی تھی، اس میں شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے پر پوشیدہ یا اعلانیہ، ظلم و تعدی کرنے سے باز رہیں گے۔ اس کے باوجود جب اہلِ مکہ کے حلیف قبیلہ بنو کنانہ اور مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ میں جھگڑا ہوا تو اہلِ مکہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو کنانہ کو ہتھیار فراہم کیے، پھر چھپ کر قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کو قتل بھی کیا۔ اسی صورتحال میں مسلمانانِ مدینہ سزا اور انتقام کے طور پر اہلِ مکہ پر حملہ کرتے ہیں۔ اسے جارحانہ حملہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ابتداء ان کی طرف سے ہوئی تھی اور جواب مسلمانوں نے دیا تھا۔ البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں پھر کہوں گا کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک سپہ سالار کی حیثیت سے ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس پر آدمی آج بھی ششدر رہ جاتا ہے۔ اس زمانے میں (۱۰) دس ہزار کی فوج چھپ کر کہیں نہیں جاسکتی تھی اور رفتار اتنی سست تھی کہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے اگر آج دو گھنٹے لگتے ہیں تو اس وقت دو ہفتے لگتے تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی فوج مدینہ سے مکہ شہر کے مضافات میں پہنچ کر کیمپ ڈالتی ہے۔ اس وقت تک مکہ والوں کو کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پھر شہر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتا ہے تو ایک قطرہ خون

بہائے بغیر۔ پھر اس کے بعد کا قصہ میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ کس طرح آنحضرت ﷺ کے ایک جملے سے، کہ آج تم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں، جاؤ سب کو رہا کیا جاتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی کایا پلٹ گئی اور وہ سب کے سب راتوں رات پورے خلوص کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ بہر حال تاریخی واقعات کی روشنی میں فتح مکہ کو جارحانہ جنگ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

سوال۷: رومن لاء دنیا کے قدیم ترین قوانین میں شمار ہوتا ہے اور اس کے اثرات دنیا کی مختلف اقوام کے قوانین پر مرتب ہوئے ہوں گے۔ رومن لاء میں کچھ قانون کافی اچھے ہوں گے۔ مختصراً بتائیں کہ اسلامی قانون کس حد تک اور کن کن نمایاں شعبوں میں رومن لاء سے متاثر ہے؟

جواب: اگر آپ کو عربی آتی ہے تو میں عرض کروں گا کہ آپ کے کتب خانے میں ایک کتاب "هل للقانون الرومی تاثیر علی الفقه الاسلامی؟" ابھی ابھی آئی ہے، جو عربی زبان میں ہے۔ اس میں پانچ مؤلفوں کے مقالوں کا ترجمہ ہے اور ان پانچوں نے اسی موضوع سے بحث کی ہے کہ آیا اسلامی قانون پر رومی قانون کا اثر ہوا ہے یا نہیں؟ ان مؤلفوں میں سے ایک اطالوی ہے، ایک انگریز ہے، ایک فرانسیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ پانچوں کے پانچوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلامی قانون پر رومی قانون کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا اور اس پر وہ بھی حیرت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مؤلف نے اپنے مضمون کا عنوان ہی " The Mystery

"of the Foundation of Muslim Law" رکھا اور اس مضمون میں اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اسلامی قانون خود بخود کیسے بن گیا؟ دوسرے الفاظ میں سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی قانون پر اگر رومی قانون کا اثر ہوتا تو اس کا کوئی وسیلہ ہونا چاہیئے تھا۔ اولاً رومی قانون لاطینی زبان میں ہے لیکن موجود صدی کے نصف دوم تک عربی یا کسی اور مشرقی زبان میں، اس کے کسی ترجمے کا پتا نہیں چلتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کی ابتداء ہی سے قرآنی احکام کے تحت، ہر قوم کو قانونی خود مختاری دے دی تھی۔ یعنی اگر دو عیسائیوں میں جھگڑا ہوا تو قانون بھی عیسائی ہو گا، جج بھی عیسائی ہو گا، فریقین بھی عیسائی ہوں گے، غرض یہ کہ انہیں اسلامی عدالت میں آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر دو مسلمانوں میں جھگڑا ہوتا تو قرآن کے مطابق فیصلہ کیا جاتا، ایک اور چیز کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں کہ اسلامی فقہ کی کتابوں میں اور رومی قانون کی کتابوں میں سے ایک ایک کو لیجیئے، اگر ایک نے دوسرے سے ماخوذ ہے تو ظاہر ہے کہ جس نے اخذ کیا ہو تو اس پر اصل ماخذ کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ جاتے ہیں۔ مگر ہمیں اسلامی قانون میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مثلاً! رومی قانون کو "یس" کا نام دیتے ہیں اور مسلمان "فقہ" کا۔ "یس" کے معنی ہیں حقوق اور فقہ کے معنی ہیں معرفت۔ مسلمانوں نے اپنے قانون کو یس یا حقوق کا نام کبھی نہیں دیا۔ اگرچہ موجودہ دور میں ترکی، ایران، مصر وغیرہ میں حقوق کی اصطلاح برتی جارہی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے طلباء یورپ کے مختلف ملکوں مثلاً فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اٹلی وغیرہ میں قانون پڑھتے ہیں، وہاں اس کے لیے "حقوق" کا لفظ پڑھتے

ہیں۔ تو وہ اصطلاح اپنے ہاں بھی برتنے لگتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے قانون کو علم الحقوق نہیں کہا بلکہ اسے علم الفقہ ہی کہتے رہے۔ میں مغربی ممالک کی فہرست میں انگلستان اور امریکہ کو شامل نہیں کرتا کیونکہ انگریزی لفظ Law کے معنی حقوق کے نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں یہاں فرانسیسی، جرمن، اطالوی زبانوں کی اصطلاح ہے، خاص کر فرانس کی علمی تاثیر ترکی، فارسی اور عربی ممالک میں بہت رہی ہے۔

دوسری چیز یہ کہ رومن لاء کی کتاب کھولیے تو اس کا پورا مواد تین اقسام پر مشتمل نظر آئے گا۔ قسم اول کا نام ہوگا "Persons" یعنی اشخاص کا قانون، پھر "Property" مال کے متعلق قانون، جب کہ تیسری قسم کو "Action" مقدمات کا نام دیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کی کتاب کھولیے تو پہلے عبادات ملیں گی یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ اس کے بعد معاملات ملیں گے۔ اس کے بعد قانونِ تعزیرات ہوگا۔ اگر رومی قانون سے اسلامی قانون متاثر ہوا ہوتا تو کم از کم ان خالص تکنیکی چیزوں میں تو اس کے اثرات باقی رہتے یعنی اسلامی قانون بھی اشخاص، مال اور مقدمات پر مبنی ہوتا لیکن ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ پھر اس کو بھی دیکھیے کہ اسلامی قانون میں بلا استثناء حنفی مالکی، شافعی اور شیعہ وغیرہ تمام فرقوں کی کتابوں میں عبادات کا ذکر پہلے آتا ہے لیکن کسی رومی قانون کی کسی کتاب میں عبادات کا ذکر کبھی نہیں آتا۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون پر اگر رومی قانون کا اثر پڑا ہے تو جن لوگوں کو اس کا دعوٰی ہے وہ اس کا ثبوت پیش کریں۔ ہمیں تو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

اس سلسے میں ایک اور چیز بھی بیان کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ جس زمانے میں مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کیا جو بیزنطینی سلطنت کا حصہ تھے، اس زمانے میں وہاں پر رومی قانون نافذ ہی نہیں تھا، مختلف وجوہ سے مقامی باشندوں کو خود مختاری دے دی گئی تھی اور ان کے معاملات عدلیہ کو ان کے مذہب کے افسروں یعنی پادریوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب رومی قانون کا اس علاقے میں وجود ہی نہیں تھا، جہاں مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا، تو اس سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک اور چیز بھی ہمارے مؤلف بیان کرتے ہیں کہ رومی قانون کی تعلیم شہر بیروت میں ہوتی تھی۔ بعض مولفوں نے کہا ہے کہ غالباً اس مدرسہ کے اثرات مسلمانوں پر پڑے ہونگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ اسلام سے دو سو سال پہلے بند ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں وہاں اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ غرض اگر اس کتاب "هل للقانون الرومی تاثير على الفقه الاسلامی" کو پڑھیں، جو آپ کے کتب خانے میں آچکی ہے تو آپ کو وہ ساری دلیلیں مل جائیں گی جو ان مختلف مولفوں نے اپنے نظریہ کے سلسلے میں پیش کی ہیں۔

سوال ۸: کل آپ نے ایک سوال کے جواب کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے امت مسلمہ کا اجماع دور صدیقی میں، مانعین زکواۃ کے بارے میں ہوا حالانکہ سب سے پہلے اجماع خلافت صدیقی پر ہوا تھا۔

جواب: ممکن ہے آپ کا بیان صحیح ہو۔ میں نے کہا تھا کہ شاید پہلا اجماع مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے بارے میں ہوا۔ باقی آپ کا جو بیان ہے کہ اجماع خلافت صدیقی پر ہوا، اس میں مجھے ذرا تامل ہے، آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ چند صحابہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کبھی بیعت نہیں کی، چند نے کچھ دیر سے کی، اور اجماع کے معنی ہیں کہ مسب متفق ہوں، ایک بھی خارج نہ ہو، ورنہ اجماع نہیں ہوتا۔ غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کبھی بیعت نہیں کی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد جب جنگیں شروع ہوئیں تو ایک فوج میں شریک ہو کر مدینہ سے بھی چلے اور اور ان کی وفات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں اسی عدم بیعت کی حالت میں ہوئی۔ کچھ لوگ دیر سے بیعت کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے آپ سب لوگ واقف ہیں۔ ان حالات میں اس کو اجماع کہنے میں مجھے ذرا تامل ہے۔

سوال ۹: شرعی قانون کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے ساتھ روحانی برتری اور تقدس کا تصور وابستہ ہوتا ہے۔ جو قانون موضوعہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس پر روشنی ڈالیے۔

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اس پر کوئی روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، آپ خود جس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں وہی کافی ہے۔ اسلامی قانون پر اگر عمل کریں تو صرف حکومت کی اطاعت نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کی بھی اطاعت

ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو دوزخ میں نہیں بھیجا جائے گا۔ اگرچہ غلام کو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل پر جزا دینے یا انعام دینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، وہ اپنے فریضہ کو انجام دے رہا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے، بے پایاں رحمت سے، اپنے غلام کو فرائض کی انجام دہی پر جنت کا بھی وعدہ کیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو دینوی قانون میں آپ کو نظر نہیں آئے گا۔

سوال ۱۰: ایک اسلامی حکومت بین القوامی تعلقات میں دوسری مملکت سے تجارت بھی کرتی ہے۔ آج کل سب مملکتیں اپنا کاروبار سود کی بنیاد پر چلا رہی ہیں۔ اسلامی بین الاقوامی قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ اگر آپ تجارت کریں تو سود کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر آپ قرض لیں تو سود کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اگر مسلمان آپس میں تجارت کا انتظام کریں اور باہم سود نہ لیں اور قرض کی صورت میں زیادہ سے زیادہ مضاربت کے اصول پر عمل کریں تو ہم سود سے بچ سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل اور غیر انٹرنیشنل لا کے باعث سود کے متعلق اسلامی احکامات بدل نہیں سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم غلام رہے، انگریز ہم پر بڑائی مسلط کرتے رہے۔ ہم مجبور تھے، لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے پاس صلاحیتیں بھی ہیں، امکانات بھی ہیں جن سے مدد لے کر ہم اپنے آپ کو اس سے بچا سکتے ہیں۔

سوال ۱۱: مجید خدوری ایک عراقی عیسائی ہے۔ اس نے اپنی کتاب Islamic Law of Nations میں جہاد کی تعرف یوں کی ہے۔

"Jihad is a collective duty imposed upon Muslim to fight the unbeliver wherever he is."

آپ نے اپنی کتاب The Muslim conduct of Islam میں Islamic Faith اور Islamic Rules میں فرق کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ:

"Islamic rule is established by all Means Including Jihad"

کیا اس نوعیت کا جہاد، اقوامِ متحدہ کے چارٹر سے متصادم نہیں۔ موجودہ دور میں جہاد کے قابل عمل ہونے پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں؟

جواب: مجھے یاد نہیں کہ آیا میں نے اپنی کتاب میں صرف یہ جملہ لکھا ہے۔ جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں، اسلام نے جارحیت شروع کرنے کی اجازت نہیں دی صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ [۲:۱۹۰]

یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اس کے معنی دفاعی جنگ کے ہوں گے۔ قاتلوا فی سبیل اللہ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جنگ کرو۔ اپنی بڑائی، برتیری یا کسی اور دنیاوی فائدے کے لیے۔ اسے جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ باوجود جنگ شروع ہو جانے کے "تعدی اور تجاوز نہ کرو" بلکہ ایک ایسا برتاؤ ہو جو انسانیت کے لحاظ سے قابل قبول ہو۔ جب جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں، صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے تو پھر پر امن بقائے باہمی (Peaceful Co-existence) کے سلسلے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام خود یہی چاہتا ہے۔ ایک چھوٹا سا نکتہ اس سلسلے میں آپ سے بیان کردوں۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو، نقل کفر کفر نباشد کے طور پر دہراتا ہوں۔ جو لوگ امن لاتے ہیں وہ اللہ کے بیٹے کہلاتے ہیں۔ یہاں امن لانے والے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ "مسلم" کا ترجمہ ہے۔ اس مشہور حدیث سے آپ واقف ہوں گے: المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ مسلم کے معنی ہیں امن لانے والا۔ تو حضرت عیسی علیہ السلام کے قول کا میں یہ ترجمہ کروں گا۔ کہ مسلمان ہی اللہ کے بیٹے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے اور جب اسلام خود امن پر زور دیتا ہے تو یہ کہنا کہ اسلام پر امن بقائے باہمی کے اصول کے خلاف ہے، میرے خیال میں درست نہیں ہو گا۔ باقی مجید خدوری کے اس بیان سے مجھے اتفق نہیں کہ To fight the unbeliever

wherever he is جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے اس وقت تک یہ بیان گمراہ کن ہو گا۔ البتہ یہ چیز صحیح ہے کہ اگر اعلان جنگ ہو چکا ہے تو دشمن کے لوگ جہاں بھی ہوں ہمیں ان سے جنگ کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن یہ حق ہمارے دشمن کو بھی حاصل ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں اس قدر جواب آپ کے لیے کافی ہو گا۔

سوال ۱۲: صرف لینن گراڈ میں Blockade کے نتیجہ میں بارہ ملین انسان لقمہ اجل بن گئے۔ Blockade کو جنیوا کنونشن آرٹیکل نمبر 3 کے تحت ممنوع قرار دیا گیا ہے، اسلامی قانون بین الاقوام کا Blockade کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ کیا کوئی Indispensable commidity of life روکی جاسکتی ہے؟

جواب: مجھے تھوڑا سا شبہ ہے کہ بارہ ملین آدمی لینن گراڈ کے محاصرہ کے دوران میں مرے۔ غالباً پوری جنگ میں جرمنی، روس، انگلستان، سب ملکوں کے ملا کر اتنے لوگ مرے ہوں گے۔ یہ نہیں کہ بارہ ملین آدمی لینن گراڈ میں مرے ہوں۔ جہاں تک Blockade یا Siege کا تعلق ہے۔ عہد نبویؐ میں اس کی دو قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک تو جنگ کے دوران میں دشمن کے گاؤں یا محلے کا محاصرہ کیا جائے۔ جیسے مدینہ میں بنی قینقاع کے یہودیوں، بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا اور وہ بھوک سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ چیز، اس نبوی طرز عمل کی بناء پر جائز ہو گی۔ ایک دوسری مثال خیبر کی جنگ ہے۔ وہاں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ مسلمان محاصرہ کرتے ہیں۔ یہود کے پاس جب تک گھر کے اندر کچھ

چیزیں موجود تھیں وہ کھاتے پیتے رہے، جب مجبور ہوئے تو ہتھیار ڈال دیئے۔ایک دوسری مثال لیجیے، یہ مکہ سے متعلق ہے۔غالباً ٦ھ کا واقعہ ہے۔ایک نجدی شخص ثمامہ بن اثال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے اچھے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے ایک منٹ پہلے میرے لیے دنیا کے بدترین شخص آپ ﷺ تھے یا پھر اب یہ کیفیت ہے کہ اب دنیا کے محبوب ترین شخص میرے لیے آپ ﷺ ہیں۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو چلتے ہوئے اعلان کیا کہ نجد کے غلوں کے انبار میں سے مکہ والوں کو اب ایک دانہ بھی فروخت نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ اپنے وطن واپس پہنچ کر مکہ والوں اناج دینا بند کر دیا. جس کے باعث، ہمارے مورخ لکھتے ہیں، کہ مکہ میں قحط پیدا ہو گیا۔ کچھ دنوں تک جیسے تیسے بن پڑا کام چلتا رہا، پھر مکہ والوں نے یا شاید خود ابو سفیان نے تنگ آ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تو حسنِ خلق کی تعلیم دتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ احسان کرو۔ اب آپ ہی کے رشتے دار بھوکے مر رہے ہیں۔آپ کو چاہیئے کہ آپ نرمی فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا جائے کہ برآمد کی ممانعت blockade ختم کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل میں ہمیں دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ دشمن کو مجبور کرنے تک محاصرہ جاری رکھتے ہیں اور دشمن کو مجبور کیے بغیر کسی مصلحت سے محاصرے اٹھا لیتے ہیں، جس میں غالباً یہ مصلحت ہوتی ہے کہ دشمن متاثر ہو گا۔ اسلام کے حسنِ سلوک کے باعث وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ